بیٹھی جا رہی ہیں، اور محرابیں اور ستون کاغذ کے کھلونوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ موسیقار اپنی موت کا راگ گا چکا ہے، اور اُسکے پروں میں آگ لگ گئی ہے، اور ہم سب اُسکی چتا میں ایک ایک لکڑی کا اضافہ کر رہے ہیں، لیکن ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہمارا کرۂ ارض اُس مدھر سنگیت سے محروم نہیں رہے گا۔ بڈھے پرندے کو راکھ ہوتے دیکھئے۔ پھر اس خاکستر میں سے ایک زیادہ جوان اور تازہ نغمہ سنج پیدا ہوگا..... اگر یہ مجموعہ آپ کو زندگی کی اس اگڑائی کی ایک جھلک بھی دکھانے میں کامیاب ہوگیا تو بس، اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ کیونکہ آج کسی کتاب کے وجود کا صرف یہی ایک جواز ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں۔

آخر میں میں اُن تمام شعراء کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تیز گامی کے باوجود مجھ پیچھے گھسٹ گھسٹ کر آنے والے کی پکار پر مڑ کر دیکھ لیا۔ ساتھ ہی مجھ پر ان حضرات کا شکریہ بھی واجب ہے۔ جنہوں نے اس مجموعے کی ترتیب میں ذاتی دلچسپی لی اور اس کا معرضِ وجود میں آنا ممکن بنایا:۔

جناب فراق گورکھپوری، جناب میراجی ۔ جناب احتشام حسین۔ جناب یوسف ظفر، جناب قیوم نظر اور جناب احسان دانش۔

محمد حسن عسکری

الہ آباد

۲۵ جنوری ۱۹۴۲ء

اثرِ صہبائی

رموزِ محبّت

(۱)

جب آنکھ کھول کے دیکھا تو ہوگیا مستور — یہ میرا دیدۂ بینا ہی اک حجاب ہوا
تو چھپ گیا مہ و انجم میں، لالہ و گل میں — ہر ایک جلوۂ رنگیں ترا نقاب ہوا
جب آنکھ بند ہوئی تو ہی جلوہ آرا تھا

(۲)

مری زبان کھلی شرحِ عاشقی کے لئے — مرا بیاں تھا مرقع مری خجالت کا
ہر ایک حرف میں تھا غیریت کا افسانہ — مری زباں نے کیا خوں مری محبت کا
مرے سکوت میں طوفانِ عشق برپا تھا

(۳)

مرے حواس لیے ہے تیرے وصل میں حائل جو بےخودی میں ہوا غرق تو ملا مجھ کو
عجیب شے ہے محبت میں خود فراموشی فنا ہوا تو ملی لذت بقا مجھ کو
مراد جو رہی اے دوست ایک پردہ تھا

احتشام حسین

بیماری کی خبر

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں۔
کچھ اندھے کوڑھی، دیوانے آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں
کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے، جاں خاموشی سے دے دے کر۔
دنیا میں مفلس رہنے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں۔
کٹتے ہیں جن کے شام و سحر اک قابل نفرت خواری سے
جو مرتے ہیں آسانی سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے غیروں نے بیمار بھی ہیں نادان بھی ہیں

جینے کی تمنا دل میں ہے اور جینے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لئے بھی ترستے ہیں؟
گو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو آسایش ہی آسایش ہے
وہ سب ہے مہیا اُن کے لئے جس چیز کی اُن کو خواہش ہے
جن کے لئے سونا مٹی ہے جن کے لئے موتی سستے ہیں

لیکن مجبور انسانوں کو کیوں حق نہیں حاصل جینے کا
طوفان ہی کے قبضے میں کیوں پتوار ہے اُن کے سفینے کا؟
کب تک بے بس انساں یوں ہی تقدیر کا رونا روئیگا؟
کب تک بے کچھ پائے ہوئے اپنا ہی سب کچھ کھوئے گا؟

کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح یہ اپنی راہ نہ پائیگا؟
کب تک موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹتا جائیگا؟

پھر خود ہی دل بول اُٹھتا ہے اب وقت بدلنے والا ہے
ذرّے سورج بن جائیں گے وہ دور بھی آنے والا ہے
اُمید کی اک ننھی سی کرن مایوسی پہ چھا جاتی ہے
اور اُس کی ضو میں ایک نئی دنیا بازو پھیلاتی ہے
سوئی سی رگوں میں چبھتی ہے، آنکھوں میں آنسو آتے ہیں
دل بے قابو ہو جاتا ہے، جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے
جاں وقف تپش ہو جاتی ہے اور عزم بغاوت کرتی ہے
اُس وقت اک سیل ارادوں کی سینوں سے ہو کے گذرتی ہے
دنیا کو خلد بنانے کا جو دھیان سا دل میں آتا ہے

ایسی خبروں کے سننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے
جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

ہم جنگ کریں گے فطرت سے، فطرت پہ قابو پائیں گے
اور فطرت پہ قابو پا کر اک روز امر بن جائیں گے

احسان دانش

شاعر

انسان و خدا و ہند کے مابین ہے شاعر
اک جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
فطرت جسے کرتی ہے عطا غیب سے خود دار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دل فرعون کا انکار

اختر انصاری

اودے شنکر

کسی نغمے کی لے ہے تیرا جسم؟ یا ستاروں کی کانپتی تنویر؟
کسی صناع کی حسیں صنعت؟ کسی بت گر کے خواب کی تعبیر؟
یا مگر اک وجود روحانی؟ جس کی ہر شعریات سے تعمیر

نرم اعضا کی جانگداز لچک دل پہ رہ رہ کے مارتی ہے تیر
ہاتھ کی سحر آفریں جنبش کھینچتی ہے ہوا پہ اک تصویر

بھر آتے ہیں آنکھ میں آنسو ہائے رقص اور اس قدر دلگیر

ہر ادائے جمیل ہے گویا درد کی شرح، سوز کی تفسیر
پھر بھی رقاص! میں ملول نہیں
ہے ترے فن سے روح لذت گیر

آل احمد سرور

مردِ درویش

(یہ نظم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے یورپ سے بصحت
وسلامتی واپس آنے پر علیگڑھ کے ایک ایٹ ہوم میں پڑھی گئی تھی۔)

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ
جلال بھی ہے، جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں شرر افشاں لبوں پہ اک دلربا ترانہ

وہ جس کی تحریر سے ہویدا جہان میں حکمتِ کلیمی
وہ جس کی تقریر سے جھلکتی ہوئی تب و تابِ غازیانہ
وہ جس کی چشمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھے
پسند لے دے کے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ
چمن بھی آتش فشاں بھی دیکھے نئے نئے آشیاں بھی دیکھے
کہیں سُنی داستانِ انجم کہیں سنا جنگ کا ترانہ

غلام قوموں میں کیا بصیرت نظر میں گرمی نہ دل میں وسعت
کسی کو پہچانتی نہیں ہیں وہ مردِ حُر ہو کہ مردِ دانا
سکوتِ ساحل سے کون سمجھے دکھے کنارِ ساحل کون پوچھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا، کسی کا طوفاں کو آزمانا
یہ بزم ابھی آشنا نہیں ہے جگر ابھی خوں ہوا نہیں ہے
ابھی مغنّی نے ہلکے ہلکے سروں میں چھیڑا ہے اک ترانا

اُفق سے ہے روشنی سی لیکن وہ چشمِ بینا کہاں سے لائیں
ابھی جبینوں سے جن کی چھوٹا نہیں فرنگی کا آستانہ

ورق ورق ہے مرا صحیفہ ملے تو کیونکر بنے تو کیونکر
اُدھر نئی آرزو کی گرمی، اِدھر خمارِ مئے شبانہ

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جسکو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ"

(اقبال)

امین حزیں سیالکوٹی

عرضِ حال

۱

بربطِ دل بجا رہا ہوں میں — آپ بیتی سنا رہا ہوں میں
ہیں دلِ پاش پاش کے ٹکڑے — اپنے لب سے جو لا رہا ہوں میں
شعر کی شکل میں متاعِ جگر — محفلوں میں لُٹا رہا ہوں میں
جانتا ہوں بقولِ اہلِ جہاں — اُلٹی گنگا بہا رہا ہوں میں
یعنی کیوں آذروں کو مثلِ خلیلؑ — بُت کدے میں نبا رہا ہوں میں
سحر کیوں ساحروں کا توڑ دیا؟ — معجزہ کیوں دکھا رہا ہوں میں؟
حسن سے کیوں کلام کرتا ہوں؟ — کیوں یہ فتنہ جگا رہا ہوں میں؟
کیوں ہوس ناکیوں کا دشمن ہوں؟ — نقش یہ کیوں مٹا رہا ہوں میں؟

ارتقائی ہیں کیوں مرے جذبات؟ ڈھونگ یہ کیا رچا رہا ہوں میں؟
میں الگ ہو گیا ہوں کیوں ان سے؟ کیوں الگ ان سے جا رہا ہوں میں؟

ان کی ہاں میں ملاؤں ہاں کیوں کر!
میں بدل لوں دل و زباں کیوں کر!

۲

چل رہا ہوں چلا رہا ہوں میں — سہہ رہا ہوں ہوں سہا رہا ہوں میں
ایک آئینۂ حقیقت ہوں — اپنے جوہر دکھا رہا ہوں میں
طبعِ روشن کی ہیں یہ پروردہ — بجلیاں جو گرا رہا ہوں میں
کھینچ کر دامنِ نگاہِ خرد — روحِ دل میں سما رہا ہوں میں
میری تخریب بانیٔ تعمیر — نئی دنیا بسا رہا ہوں ہوں میں
میرے دامن میں صد جہانِ بہار — ابرِ رحمت ہوں چھا رہا ہوں میں
حسن اور عشق کے رموزِ لطیف — بوالہوس کو سکھا رہا ہوں میں

زندگی کیا ہے اور کیوں کر ہے؟ خاکیوں کو بتا رہا ہوں میں
"دیدۂ غیر بیں" دنیا کو چشمِ "خود بیں" بنا رہا ہوں میں
یعنی میں اک چراغِ فطرت ہوں — جل رہا ہوں، جلا رہا ہوں میں

گل سے رغبت نہ آشیانے سے
میں الگ ہوں اس زمانے سے

اندرجیت شرما

فلسفۂ دنیا

سرمایۂ سکوں ہے نہاں اضطراب میں — دریا کی روح بند ہے ریگِ سراب میں
بیدار ہے وہی جو ہے دنیا کے خواب میں — یعنی ہر ایک حسن ہے عریاں حجاب میں

ہے آشکار جوشِ خزاں میں بہار کا
آوازۂ زغن میں ہے نغمہ ہزار کا

دنیا کی زندگی کو فنا پر ثبات ہے — ہر اک حباب ساغرِ آبِ حیات ہے
تاریکیوں میں نور کی سب کائنات ہے — باطل ہے جس کا نام وہی حق کی ذات ہے

حدِ زوال موجبِ قدرِ کمال ہے
جامِ مئے فراق میں لطفِ وصال ہے

انساں جہاں میں ہوتا ہے بدیوں سے نیک نام — مضمر زبانِ گنگ میں ہے خوبیٔ کلام
لذت سے آبِ سرد کی واقف ہے تشنہ کام — تکلیف کا نظام ہے آرام کا نظام

ضدین پر ہر ایک کا قائم اساس ہے
ظاہر میں جو ہے دور حقیقت میں پاس ہے

الحاد کے نشان نے ایماں بنا دیا — حیوان کے وجود نے انساں بنا دیا
جب ہذیاں بنا دیا معاں بنا دیا — ایک لفظ تھا نہیں نے جسے ہاں بنا دیا

انساں کی لغت میں جب انکار آگیا
خود غیب سے ظہور میں اقرار آگیا

ہے علم کا وجود جہالت کے واسطے — کثرت کا امتیاز ہے وحدت کے واسطے
سیرت کا ہے خیال جو صورت کے واسطے — جزو لطیف بھی ہیں کثافت کے واسطے

افسردگی نہ ہو تو کبھی تازگی نہ ہو
خشکی اگر نہ ہو تو نمایاں تری نہ ہو

سندکا دھیان آتا ہے بالیں کے سنگ سے — محفل طرب کی گرم ہے ماتم کے رنگ سے
پیغام صلح ملتا ہے روحوں کو جنگ سے — امن و اماں کا راج ہے توپ و تفنگ سے

لطف شکر ہے تلخ دوا میں چھپا ہوا
خاروں کے بیچ میں ہے گل تر کھلا ہوا

تمہید ہے مآل کی آغاز کا پیام — جھڑتے ہیں برگ و بار تو سمجھو نمو کا کام
اک زندگی کی صبح ہے اک زندگی کی شام — جو نام ہے فنا کا وہی ہے بقا کا نام

اوجھل ہوا نظر سے تو سمجھو وصال ہے
ماضی کے رنگ و روپ میں تصویر حال ہے

آواز یہ نکلتی ہے ہستی کے ساز سے — بنیاد ہے جہاں کی نشیب و فراز سے
بنتا ہے قلب آئینہ سوز و گداز سے — ہے قدر حسن و عشق کی ناز و نیاز سے

قائم اسی اصول پہ رنگ زمانہ ہے
فطرت کا کاربندیوں ہی کارخانہ ہے

احمد ندیم قاسمی

قانون قدرت

گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سونا ہو گیا
بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا
تاریکیوں کی دیویاں کرنے لگیں سرگوشیاں
اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگیں خاموشیاں
مشرق کے پربت سے دبے ابھریں گھٹائیں یک بیک
انگڑائیاں لینے لگیں بے خود ہوائیں یک بیک
تارے نگلتی بدلیاں چاروں طرف چھانے لگیں
چھم چھم پھواروں کی جھڑی دھرتی پہ برسانے لگیں

کتّے اچانک چونک کر بھونکے دبک کر سو گئے

بے رس نچوڑی ہڈیوں کی لذتوں میں کھو گئے

مائیں لپکتی ہیں کہیں، بچے بلکتے ہیں کہیں

اور کھاٹ لینے کے لئے بوڑھے اچکتے ہیں کہیں

اک سرسراہٹ سی اٹھی، لرائی ختم کر رہ گئی

ہر چیز نے آنکھیں ملیں ہر چیز جم کر رہ گئی

پھر گنگناتی ظلمتوں کا سحر ہر سو چھا گیا

بادل کہیں گم ہو گئے تاروں پہ جوبن آگیا

قدرت کے سب چھوٹے بڑے قانون ہیں یکساں مگر

پردے پڑے ہیں جا بجا جھنتی نہیں جن سے نظر

انسان کا معصوم دل تاریک سونا شہر ہے

جس کے تلے احساس کی چنگاریوں کی لہر ہے

جب دیکھتا ہے وہ کہیں بدمست پن گھٹ والیاں

گالوں کو جن کے چومتی ہیں پتلی پتلی بالیاں

زلفیں گھٹاؤں کی طرح، آنکھیں ستاروں کی طرح

چلنا ہواؤں کی طرح، رنگت شراروں کی طرح

لہنگے کی لہروں کے تلے کھن سے پاؤں رقص میں

پگڈنڈیوں کے اس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں

سینے چھلکتے سے کدرے، اور ہونٹ پیمانوں کے لب

ٹخنوں پہ بجتی جھانجنیں ہنسنا ہنسانا بے سبب

یہ دیکھ کر انگڑائیاں لیتا ہے دل انسان کا

اور اس کی ہر دھڑکن پہ ہوتا ہے گماں طوفان کا

گلیوں میں چھپ جاتی ہیں جب یہ چلتی پھرتی بجلیاں

ہوتا ہے طاری روح پر سنسان راتوں کا سماں

آنند نرائن ملّا

نذرِ ٹیگور

خوشا وہ یادِ جولائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا

تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں

کہ ذرّے ذرّے پہ برسا ہے ابرِ جام ترا خوشا وہ یادِ جولائی زباں پہ نام ترا

تجھے فروغِ بصیرت سے دیکھنا چاہا
ابھر کے عقل کی ظلمت سے دیکھنا چاہا

تجھے حیات کی رفعت سے دیکھنا چاہا
نظر کو مل نہ سکا پھر بھی اوجِ بام ترا خوشا وہ یادِ جولائی زباں پہ نام ترا

بلند طائرِ سدرہ سے آشیاں تیرا
نظامِ شمس و قمر پیشِ آستاں تیرا
ستارے روندتا چلتا ہے کارواں تیرا

کہ روحِ قدس کے پہلو میں ہے مقام ترا خوشا وہ یادِ جولائی زباں پہ نام ترا

جہاں کے دشت میں تخئیل جوئے آب ہے تو
ابھی جو تشنۂ تعبیر ہے وہ خواب ہے تو
اُفق پہ ہے جو دلوں کے وہ آفتاب ہے تو

ابھی دیارِ شفق میں ہے دورِ جام ترا خوشا وہ یادِ جولائی زباں پہ نام ترا

شبیہ حُسن ہے تیرے نگار خانوں میں
سرودِ عشق جواں ہے ترے ترانوں میں

حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں
کہ اک بہشتِ ترنم ہے یا کلام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
ہے گونج لے میں تری سرمدی ربابوں کی
ترے نفس میں مہک سی ہے گلابوں کی
تری نظر میں ہے دنیا بشر کے خوابوں کی
ہر اک طلوعِ سحر میں ہے عکس شام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
کدورتوں پہ سدا خاک ڈالنے والا
خصومتوں کو محبت میں ڈھالنے والا
دلوں سے درد کا کانٹا نکالنے والا
سکون و امن کا حامل ہے ہر پیام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
حیات فانیٔ انساں کی انتہا ہے جہاں
مسرتِ ابدی دل سے آشنا ہے جہاں

بشر کی روح کی تکمیل ارتقا ہے جہاں
وہاں سے نور فشاں ہے سہیلِ جام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
وطن میں دھوم ہے ہر سمت اوستادوں کی
بساطِ شعر پہ اک فوج ہے پیادوں کی
تجھی پہ ختم ہوئی نسل دیوزادوں کی
ادب کے کوہ ہمالہ پہ ہے مقام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
وہ زیست پائے کہ اک کائنات رشک کرے
وہ خوبیاں تھیں کہ ہر ذی صفات رشک کرے
ملی وہ موت کہ جس پہ حیات رشک کرے
یہ بزم سوگ ہے تیری کہ جشن عام ترا خوشا وہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا

بلقیس جمال

دریا کے کنارے

پانی بہتا چلتا ہے — کچھ دکھ سہتا چلتا ہے
سناٹا سا کچھ چھایا ہے — پانی کچھ مرجھایا ہے
لہریں ہیں کچھ میلی میلی — موجیں ہیں کچھ پھیلی پھیلی
تارے جھک جھک پڑتے ہیں — پتے چپ چپ جھڑتے ہیں
ابر کے ٹکڑے اڑتے ہیں — کٹتے ہیں اور پھر جڑتے ہیں
تارے جھم جھم ہوتے ہیں — طائر چپکے سوتے ہیں
شاخیں سر بگریباں ہیں — بالکل چپ اور حیراں ہیں
چاند بھی ہے کچھ کھویا کھویا — کچھ جاگا سا کچھ سویا سویا

ابر میں چھپ چھپ جاتا ہے — ہر تارے کو چمکاتا ہے
کچھ بہکا بہکا چلتا ہے — پانی میں بھٹکتا چلتا ہے
شبنم ٹپ ٹپ روتی ہے — جو آنسو ہے وہ موتی ہے
جنگل چپکا سوتا ہے — منظر پر سناٹا ہے
ہر پتے میں خاموشی ہے — ہر کونپل میں بے ہوشی ہے
ہر ذرہ چپ ہے قطرہ چپ ہے — افلاک کا اک اک تارا چپ ہے
سب گلہائے ریحاں چپ ہیں — چمپا کی سب کلیاں چپ ہیں
دریا کی سب موجیں چپ ہیں — بل کھانے والی لہریں چپ ہیں
سوتی ہے گلوں میں چپ خوشبو — جھل مل ہوتے ہیں جگنو
چلتی ہے ہوا کچھ دھیمے دھیمے — پھولوں کی فضا میں چپکے چپکے
ہلکے ہلکے گیت سناتی — رک رک کر اک تان لگاتی
جھکے جھکے پھول رسیلے — چپکے چپکے کچھ سنتے

یہ خاموشی اور سناٹا اور یہ ساکت موجِ دریا
ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں اس دنیا کا ہر ذرہ دیکھوں
یارب یہ سب منظر کیا ہیں صحرا کیا ہیں گھر در کیا ہیں
خاموشی کیا ہے؟ سناٹا کیا ہے آدھی رات کا دریا کیا ہے؟

یہ سب کیوں ہیں، یہ سب کیا ہے؟
خود میں کیا ہوں، جمالہ کیا ہے؟

تاجور نجیب آبادی

دوست سے خطاب

محبت افروز ہے فروغِ جبیں ہوس سوز ہیں نگاہیں
جمالِ عصمت سے رُخ درخشاں عفت آموز ہیں نگاہیں
نظر کی احساس آفرینی دلوں کو درد آشنا بنا دے
خدا کا منکر بھی زد پہ آجائے تو اُسے باخدا بنا دے
جلال اتنا کہ حسنِ سرکش میں بھی ہو شانِ نیاز پیدا
جمال ایسا کہ جس کی تابش سے پتھروں میں گداز پیدا
وجاہت اتنی کہ شوقِ دیدار کو مجال نمو نہیں ہے
لیاقت ایسی کہ کم سوادوں کو جرأتِ گفتگو نہیں ہے

ذہانت اتنی کہ عقل خود بیں کو تو اسیر نیاز رکھے

صداقت ایسی کہ شاعروں کو مبالغے سے بھی باز رکھے

ظرافت اتنی کہ تلخ نوش غم محبت کو بھی ہنسائے

متانت ایسی کہ عشق و الفت کی شوخیوں کو ادب سکھائے

سرشت اتنی لطیف صدق و صفا کا گنجینہ جس کو کہئے

طبیعت ایسی شریف مہر و وفا کا آئینہ جس کو کہئے

پسند اتنی بلند تعلیم ذوق دے چشم بے ہنر کو

مذاق ایسا نفیس حسن مذاق جس سے ملے نظر کو

حسد تری بزم میں جسے لائے خلق تیرا غلام کر لے

جو رم کرے کوئی تجھ سے ازراہ بغض تو اس کو رام کر لے

جو تیرے جلووں سے ہو منور اس آئینے میں نہ بال آئے

مٹے خیال گناہ دل سے جو دل میں تیرا خیال آئے

سجھائی تو نے ہی مجھ کو اے دوست پستی ما سوا پرستی

تجھی سے سیکھا کہ خود پرستی ہے درحقیقت خدا پرستی

ترے فروغ جمال کی تابشیں مجھے یہ بتا رہی ہیں

کہ تیری صورت میں تیری سیرت کی طلعتیں جگمگا رہی ہیں

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو اس کی شان جمیل تو ہے

خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک سب سے روشن دلیل تو ہے

تخت سنگھ

بھولی بسری رات

پچھلی رات کا چاند دکھائی دیتا تھا کچھ یوں تاروں میں
جیسے کوئی جان بوجھ کر کود رہا ہو انگاروں میں

دھرتی سے آکاش تلک کرنوں کا سندر جال بچھا تھا
راج تھا سپنوں کا سب جگ پر چھایا ہوا اک سناٹا تھا

لہروں کی مندر سلوٹوں میں ندی بس گھول رہی تھی
دھیمے دھیمے مدھر سروں میں شاید وہ کچھ بول رہی تھی

پیڑ کنارے پر بھیگی پروائے کانپ رہے تھے تھر تھر
رہ رہ کر اک آدھ ان دیکھا پنچھی چیخ اٹھتا تھا جن پر

دور اک پربت کی اونچی چوٹی پر اک چھوٹی سی بدلی
کیا جانے پورب کے دھندلے منڈل میں کیا ڈھونڈ رہی تھی

ایسے میں ہم دونوں اک ہلکی سی ننھی ناؤ میں بیٹھے
جھل مل جھل مل کرتے پانی کی چھاتی پر تیر رہے تھے

تیری رُخ پہ پریشاں کاکل کھیل رہی تھی نرم ہوا سے
روپ میں تیرا سندر مکھڑا کیسں سہانا تھا چندا سے

بجلی ایسا نور آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا کچھ ایسے
چلتے ہوں دو ننھے ننھے دیپک کالی رات میں جیسے

رہ رہ کر ساری کا آنچل کاندھے پر سے ڈھلک جاتا تھا
رہ رہ کر تجھ سے کچھ کہنے کو میرا جی للچاتا تھا

لیکن رُک جاتی تھی ہونٹوں پر جو بات اٹھتی تھی من میں
پریم کی جھنجلتا اُلجھی تھی لاج کی ان سلجھی الجھن میں

جھوم رہا تھا جاگتے سپنوں کا سنسار آنکھوں میں ایسے
اوس کی موتی جھول رہے ہوں پھولوں کے جھولوں میں جیسے

انگ انگ بے چین تھا، چھو ہاتھوں سے چھوٹا جاتا تھا
اور یوں میرے صبر کا پیالا رہ رہ کر چھلکا جاتا تھا

ایکا ایکی تو نے بھری اک ٹھنڈی سانس انگڑائی لے کر
چپ کی تھکن سے باز آئی تھی، سر کو رکھا میرے کاندھے

پھر کیا تھا دل ایسے مچلا اپنے آپ کو بھول گیا میں
زور سے تجھ کو بھینچ کر اپنی باہوں میں کچھ بول اٹھا میں

اک میں کیا آکاش کے تارے بھی وہ رات نہیں بھولے ہیں
جس کو گذرے آج تو لگ بھگ چار مہینے بیت گئے ہیں

اب بھی اس کی یاد مچا دیتی ہے اک ہلچل سی من میں
ایسی رات نہیں آتی ہے پلٹ کر کیوں مرے جیون میں؟

تصدق حسین خالد

پیام

فضاؤں میں کوئی نادیدہ نامعلوم رستہ ہے
جہاں جذبات مضطر، روح کے سیماب یا قاصد،
صعوبات سفر سے بے خبر اک دور منزل کو،
یہ دل میں الفتوں کے راز کو لے کر،
ہواؤں کی طرح آزاد پروا اڑتے جائیں،
پیام شوق دے آئیں؟
اگر اس رات، اس بے راہ رستے پر،
کوئی جذبہ دل بیتاب سے اٹھ کر،

عناں بر داشتہ نکلے،
اشارے گرم جوشِ آرزو آئیں گے ایشر پہ
اُنھیں پڑھنا،
اگر منظورِ خاطر ہو،
جواباً ایک جذبے کو سوارِ برق کر دینا۔

تلوک چند محروم

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے　　کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے　　اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کے شبِ رنجور کا عالم

اے حُسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے　　کس باغ کے گُل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے　　ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دل گیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر یہ دورِ زمانہ کے الٹ پھیر، یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر اے گردشِ ایام! یہ اندھیر! یہ اندھیر
ماہِ فلکِ حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ ترے حسنِ نوازش کا گلہ ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا اٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا
یہ عالمِ تنہائی، یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر اُڑ اُڑ کے لگا دیتے ہیں در و بام کے چکّر
معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے
جو گل رخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے، جانِ بخشِ جہاں تھے تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے پڑے زیرِ زمیں ہیں!

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں　　ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر، نہ ایواں　　آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

جوش ملیح آبادی

کِسان

جھٹ پٹے کا نرم رَو دریا شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دُھندلے دُھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بُجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود
وُسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا

شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا

تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان

بام گردوں پر کسی کے رُوٹھ کر جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور

چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر، سُرخی سرخیوں میں کچھ دھواں

بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی

نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں ادراک قومی انسان یعنی کاشتکار

ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ پوستاں

ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں

ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ

نازپروردِ لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم

محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم

صبح کا فرزند، خورشیدِ زرافشاں کا علَم

محنت و بیم کا پیماں سخت کوشی کی قسم

جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ

ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسّم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خُو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے، کلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بُو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ و گُل بن کے اتراتی ہے خاک
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے ہے عزّ و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پہ لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

خوش نما شہروں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شام زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر حسین
جس کا دبنا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں

اُس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر

جس میں آجاتی ہے تیری کھیتیوں کو روند کر

اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے

دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ

فاقہ کش بچّوں کو دُھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ

پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

گھر کی نا اُمید دیوی کا شبابِ سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا۔

بے ردا بیوی کا سر، بچّوں کا مُنہ اُترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں

گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے

یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں شقاوت کے شرار

جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ

کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات؟

ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی

بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیِ امن و اماں!

گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر اُنگلیاں

ادعائے پیروی دیں و ایماں اور تو!

دیکھ اپنی کُہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں

کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

جاں نثار اختر

بگولا

جون کا تپتا مہینہ، تمتماتا آفتاب
ڈھل چکا ہے دن کے سانچے میں جہنم کا شباب
دوپہر اک آتشِ سیال برساتی ہوئی
سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی
وہ جھلستی گھاس، وہ پگڈنڈیاں پامال سی
نہر کے لب خشک سے ذروں کی آنکھیں لال سی
چلچلاتی دھوپ میں میدان کو چڑھتا بخار
آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار

دیکھ وہ میدان میں ہے اک بگولا بے قرار
آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار
چاک پہ جیسے بنائے جا رہے ہوں زلزلے
یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے
ڈھالنا چاہے زمیں جس طرح کوئی آسماں
جیسے چکر کھا کے نکلے توپ کے منہ سے دھواں
مل رہا ہو جس طرح جوشِ بغاوت کو فراغ
جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دماغ
خشم گیں ابرو پہ ڈالے خاک آلودہ نقاب
جنگلوں کی راہ سے آئے سفیرِ انقلاب
یوں بگولے میں تپتے سرخ ذرّے بے قرار
جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرار

کس قدر آزاد ہے یہ روحِ صحرا یہ بھی دیکھ
کس طرح ذروں میں ہے طوفاں پیرایہ بھی دیکھ

اٹھ بگولے کی طرح میدان میں گاتا نکل
زندگی کی روح ہر ذرے میں دوڑاتا نکل

حفیظ جالندھری

پریت کا گیت

(۱)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے — او مورکھ او بھولے بھالے
دل کی دنیا کر لے روشن — اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی — بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا　　چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا

شیخ برہمن دونوں رہزن　　ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا

ظاہر داروں کی سنگت میں　　کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

من ہے تیرا میت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری　　دُکھیارے ہیں سب نر ناری

تو ہی اُٹھالے سُندر مرلی　　تو ہی بن جا شام مراری

تو جاگے تو دنیا جاگے　　جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

گائیں تیرے گیت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت

لبالے

اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے　　دکھ کا دار و پیار ہے پیارے

آجا اصلی روپ میں آجا　　توہی پریم اوتار ہے پیارے

یہ ہارا تو سب کچھ ہارا　　من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے جیتے جیت

لبالے

اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت

لبالے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے　　سر چائے پر میت نہ جائے

میں ڈرتا ہوں کوئی تیری　　جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہے جلدی کر لے　　تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

لبالے

اپنے من میں پریت

حامد علی خاں

یاد

کلفت میں بھی بہانۂ راحت ہے تیری یاد
دوزخ میں بھی مرے لئے جنت ہے تیری یاد

پھر روتے روتے یاد نہیں آ گئی تری
تاریک دل میں نورِ مسرت ہے تیری یاد

حرص و ہوس کی گرد سے دل صاف دھل گیا
روحِ صفا و جانِ لطافت ہے تیری یاد

دل سے فسانۂ غمِ عالم بھلا دیا
سحرِ وفا، فسونِ محبت ہے تیری یاد

کس سنگ سخت سے گہرِ مدعا ملا
خوش ہوں کہ حاصلِ غمِ فرقت ہے تیری یاد

میں دو جہاں بھی کھو کے نہ بے مایہ ہو سکا
اے روحِ دو جہاں کی دولت ہے تیری یاد

گویا بسی ہیں اس میں دو عالم کی رونقیں
یہ کیا طلسمِ خانۂ حیرت ہے تیری یاد

یہ آ گئی تو دل میں نہ کچھ بھی ٹھہر سکا
دنیا و دیں کی یاد کی رخصت ہے تیری یاد

پایا تجھے تو غایتِ ہستی کو پا لیا
آئینِ دو جہاں سے فراغت ہے تیری یاد

میں ایک قدم بھی ہٹ نہ سکا راہِ زیست سے
آخر کھلا کہ راہِ سلامت ہے تیری یاد

بے لطف ہے فسانۂ ہستی ترے بغیر
اس زندگی کی اصل حقیقت ہے تیری یاد

ہر بزم میں ہے ذکر ترا اور زباں مری
ہر روز ایک تازہ حکایت ہے تیری یاد

میرا سیاہ خانہ تو شایانِ ذکر کب
جنت بھی ہو تو اس کی بھی زینت ہے تیری یاد

جب تو نہیں تو پھر یہ غمِ جاوداں ہے کیا
خالق سے زندگی کی شکایت ہے تیری یاد

جیسے غمِ ازل سے مرا دل مراد ہے
درد ابد سے یوں ہی عبارت ہے تیری یاد

مجھ سے الم نصیب پہ اور یہ نوازشیں
مہر و وفا و لطف و مروت ہے تیری یاد

حفیظؔ ہوشیارپوری

آج کی رات

چاندنی رات ہے جوانی پر

دستِ گردوں میں ساغرِ مہتاب　　نور بن بن کے چھن رہی ہے شراب
ساقیِ آسماں پیالہ بدست　　میں شرابِ سرور سے سرمست
فکرِ دوزخ نہ ذکرِ جنّت ہے　　میں ہوں اور تیری پیاری صورت ہے

رس بھرے ہونٹ، مدبھری آنکھیں!

کون فردا پہ اعتبار کرے　　کون جنّت کا انتظار کرے
جانے کب موت کا پیام آئے　　یہ مسرت بھی ہم سے چھن جائے
دامنِ عقل چاک ہونے دے　　آج یہ قصّہ پاک ہونے دے

خم کو ناپائدار کر دیں ہم　　موت کو شرمسار کر دیں ہم
لب سے لب یوں ملیں کہ کھو جائیں　　جذب اک دوسرے میں ہو جائیں

میں رہوں اور نہ تُو رہے باقی!

کس قدر دلنشیں ہیں لب تیرے　　بادۂ احمریں ہیں لب تیرے
تیرے ہونٹوں کا رس نہیں ہے یہ　　آبِ کوثر ہے، انگبیں ہے یہ
شہد کے گھونٹ پی رہا ہوں میں　　آج کی رات جی رہا ہوں میں

آج کی رات پھر نہ آئے گی!

رابعہ پنہاں

مسافرِ شب

سکوتِ شب کی ہے جلوہ فروشی — ہے موجودات پر چھائی خموشی
فضائے شام کو نیند آ رہی ہے — مناظر پر سیاہی چھا رہی ہے
ہے بدلا رنگ دن کے شور و شر کا — ہوا تاریکیوں کا دور دورا
رُکا ہنگامہ ہائے دل کا محشر — بڑھا شب کا سکوں بر دوشِ منظر
ہے آخر روز روشن کی کہانی — ہوئی تاریک بُردِ آسمانی
گیا راحت کدے میں مہرِ تاباں — ہوئے انوار آتش بار پنہاں
ہے تاریکی پیامِ خوابِ نوشیں — خوشی سے ہے نویدِ رنگِ تسکیں
فضائے غرب ہے پیغامِ راحت — اُفق کی خامشی الہامِ راحت

ہے رنگینی فضا کی کیف عشرت — شفق کی سرخیاں سامانِ فرحت
ہواؤں میں بھرے ہیں نغمۂ شب — ہے راحت زا ربابِ زمزمۂ شب
ہوا روشن نگارِ شب کا جلوہ — ہیں تنویریں فلک پر کار فرما

ستاروں کی تبسم باریوں میں — کواکب کی منور دھاریوں میں
سطورِ کہکشاں کی لغزشوں میں — ثُریّا کی مجلّا تابشوں میں
فضائے سیم آرائے فلک میں — اُفق کی روشن و زریں جھلک میں
ضیا افروز ہے ماہِ درخشاں — لبوں کی تابشیں ہیں خندہ افشاں

فضائے آسمانی رہ گزر ہے — مسافر رات کا گرمِ سفر ہے
سیاہی شب کی ہے ہمراز و ہمدم — سکوتِ شام ہے دمساز و محرم
ہے تنہائی سے رسمِ آشنائی — خیالِ ماسوا سے بے نیازی

سفر کی کیفیت مدّنظر ہے — کہ تخیّل سفر لطفِ سفر ہے
خبر ہی کچھ نہیں حدِ سفر کی — نہ کچھ پرواہ طولِ رہگذر کی
خوش و مطمئن ہے جادہ پیما — جبیں پہ استقامت جلوہ فرما
سکوتِ شب میں جو یوں سرگراں ہے — مہ کامل تری منزل کہاں ہے
تری رہبر اُفق کی خامشی ہے — انیس و ہم سفر اک چاندنی ہے

~~~

کمالِ زیست تیری جستجو ہے — یہ طرزِ سعی حدّ آبرو ہے
سبق آموز تیری داستاں ہے — تجھے حاصل کمال کامراں ہے
تری سعیِ عمل لا انتہا ہے — ابد تک اس سفر کا سلسلہ ہے

~~~

راجہ مہدی علی خاں

قصرِ ویراں

ڈوبا شفق کی جھیل میں خورشیدِ خاوری
انگڑائی لے کے غرب سے لیلائے شب اُٹھی
مہکے ہوئے چمن کی ہوائیں اُداس ہیں
کیا کھو چکی ہیں آج فضائیں اُداس ہیں
کھڑکی میں آسمان کی حیراں ہے چاند بھی
شاید مری طرح سے پریشاں ہے چاند بھی
سوئی ہوئی بہار کے چہرے پہ یاس ہے
غمگین دل کی طرح گلستاں اُداس ہے

آتی نہیں ہے دور سے کوئل کی اب صدا
گاتی نہیں ہے گیت مسرت کے اب ہوا
یہ گھر اور اس کے گرد جو شے ہے اُداس ہے
جو مُردنی ہے دل میں وہی آس پاس ہے
ہر سال آکے دیکھتا ہوں تیرے گھر کو میں
اب تک غریب ہوں ترے دیوار و در کو میں
سنتا ہوں اب بھی یاں ترے قدموں کی میں صدا
آ آکے ڈھونڈتی ہے تجھے یاں مری نگہ
جس گھر پہ حکمراں ترے جلووں کی تھی بہار
وہ گھر بنا ہے میری محبت کا اب مزار

سعید احمد اعجاز

سعیٔ خام

چاندنی کے ساز پر ہے محبت نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز بن گیا ہے رُوحِ ساز
راگنی کو لے کے دور جا رہی ہے موج نور
بھیجتا ہوں تیرے نام
موج سمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام!
جس طرح بچّہ کوئی ناؤ اپنی کاغذی
آب جو میں چھوڑ دے اور توقع یہ کرے

ناؤ اُس کی جائے گی اور کھلونے لائے گی
مادر مرحوم سے شہر نا معلوم سے
پھر کنارِ جوئبار وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دور سے دُور سے آتے ہوئے
دیکھتا ہو تا یہ شام!

سلام مچھلی شہری

سات پینٹنگ

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں
ایسے خطوط کھینچوں کہ مغرور ہو سکوں

(۱)

اک نوجواں کو شہر میں تشویشِ روزگار
اور دور ایک گاؤں میں برسات کی بہار
ہاتھوں میں اک حسینہ کے ٹوٹا ہوا ستار

(۲)

دریا سے ہٹ کے سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں

پگڈنڈیوں سے دور وہاں پیپلوں کی چھاؤں
یہ دُھندلی دُھندلی صورتیں، یہ میلے میلے پاؤں

(۳)

موجوں کے رُخ پہ چھوٹی سی کشتی رواں دواں
دریا کے اس بہاؤ سے ملّاح بدگماں
ساحل کے ایک جھونپڑے میں موت کا سماں

(۴)

کچھ لوگ محوِ سیرِ چمن زار "شالا مار"
سنتا ہے سامراج کی دولت کا شاہکار
پھاٹک پہ ہٹکے میلے فقیروں کی اک قطار

(۵)

سونے کا ماہتاب مناروں کے درمیاں

چاندی کا آفتاب چناروں کے درمیاں
اور اک "خدا" فضائی نظاروں کے درمیاں

(۶)

زنداں کی ایک شمع پہ پروانے مضطرب
اور اپنی اپنی فکر میں دیوانے مضطرب
باہر حیاتِ تازہ کے افسانے مضطرب

(۷)

سڑکوں پہ انقلاب کی گونجی ہوئی صدا
کالج کے ایک ہال میں دنیا پہ تبصرہ
اک نوجواں کے ہاتھ میں اخبار آج کا

موضوع اتنے جیسے کہ گھبرا رہا ہوں میں
شاید کہ اپنی فکر پہ خود چھا رہا ہوں میں

سیماب اکبرآبادی

ہندوستان

وہ پرستش گاہ فطرت سجدہ گاہ آفتاب — کردگارِ صبحِ مشرق شامِ گیتی کا شباب
تھا صنم زارِ عرب جس کے صنم خانوں کی دھوپ — آتشِ بزمِ عجم تھی جس کے ایوانوں کی دھوپ
بتکدوں میں جس کے زندہ تھے بتانِ آذری — عشق کی پروردگاری، حسن کی پیغمبری
سرخ صندل سی جبینیں اُن پہ قشقوں کے چراغ — برگ سے نازک طبیعت، پھول سے نازک دماغ
جس کے دریا آئینے پگھلے ہوئے بہتے ہوئے — جس کے پربت کائنات ابر کو گھیرے ہوئے
جس کی ندیاں موجِ مے کی طرح لہراتی ہوئی — گھومتی، گرتی، گزرتی، گونجتی، گاتی ہوئی
شام مستی آفریں، رنگِ سحر جلوہ پناہ — عشق کی پہلی جماہی، حسن کی پہلی نگاہ
لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی — اک گھٹا برسی ہوئی اور اک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگین خدنگ — مختلف رنگوں کا جیسے اڑ رہا ہو اک پتنگ

دیکھ کر افغانیوں نے اس کی پروازِ جمیل — لے لیا آغوشِ تربت میں بہ اندازِ جمیل
مل گئی شمعِ حرم بت خانے کے فانوس سے — ابنِ آذر نے اذاں دی پردۂ ناقوس سے
مسلکِ بدھ کو تحفظ کا اشارہ مل گیا — کرشن کے مندر کو مسجد کا سہارا مل گیا
ذرّہ ذرّہ محلِ زہرہ نظر آنے لگا — خون سا شفقہ ثریا بن کے اترانے لگا
رایتِ مسلم نے پرچم کہکشاں پہ رکھ دیا — چند صدیوں میں زمیں کو آسماں پہ رکھ دیا

ہند علم و فضل و رعنائی کا گہوارہ بنا
یہ پتنگ اتنا ہوا اونچا کہ ستارہ بنا

شامِ مغرب یہ ستارہ دیکھ کر للچا گئی — سادہ دل پے نور آنکھوں میں چکاچوند آ گئی
فلسفی بھی دام لے کر پہنچے تجار بھی — اپنا پھندا لے کے اُٹھا دیوِ استعمار بھی
عرشِ سطوت پہ تھی موجِ عشرت افشانیاں — جلوۂ ساغر سے تھیں چمکی ہوئی مہتابیاں

تھیں یہی دو چار باتیں گرمیٔ بزمِ شباب
نغمۂ مطرب کنارِ شاہد و جامِ شراب

کارواں غافل ہوا، رُعبِ شبِ منزل گیا
پاسبانِ وقت کو شبخوں کا موقع مل گیا

شامِ مغرب صبحِ مشرق پر یکایک چھا گئی
سُرخ اک بدلی زمیں سے آسماں تک چھا گئی

اب وہ سیارہ جو رفعت پر سبک پرواز تھا
پستیٔ حالات سے پھر نقش پا انداز تھا

آہ اے ہندوستاں! یہ تیری پستی وہ شباب
کچھ تری تقدیر میں ہی فطرتاً ہے انقلاب

گو بظاہر تو نشاطِ ندرتِ ایام ہے
فی الحقیقت بے سکوں، بے چین، بے آرام ہے

وہ بہاریں، وہ چمن، وہ گلشنِ ایجادی کہاں
اے غلام آباد و اب وہ تیری آزادی کہاں

بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرّے ایک قطرے پہ نہیں ہے اختیار

اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب
تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب

روح سے خالی ہے لیکن پیکرِ مردہ ترا
جلوۂ پُرمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا

جیسے شمعِ صبحِ محفل، جیسے چھنتا آفتاب
جیسے شاعر کا بڑھاپا، جیسے بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

شاد عارفی

عورت

تابشِ خورشید، نورِ ماہ، پانی کی جھلک
خندۂ قلقل، صدا کوئل کی، غنچوں کی چٹک
لرزشِ سیماب، بجلی کی تڑپ، شاخوں کا لوچ
عقل کی تیزی، طبیعت کی اُپج، شاعر کا سوچ
اضطرابِ موج، کانٹوں کی خلش، ناگن کے بل
تیر کی سُرعت، کماں کا عجز، شمشیروں کے پھل
آبِ موتی کی، چمک کُندن کی، ہیرے کی دمک
اشرفی کا روپ، ٹکسالی محاصل کی کھنک

دامنِ کہسار کے منظر، نوائے آبشار
شورِ دریا، کروٹیں لہروں کی، ساحل کا قرار
زمزمے کا عطر، کیفِ نغمہ، لے کی پختگی
شورشِ مے، نغزشِ مے نوش، جوشِ بیخودی
آہوئے رم خوردہ کی دہشت، طرارے تیزیاں
گائے کی سنجیدگی، جگنوں کی آتش ریزیاں
وادیٔ کشمیر کی نُزہت، گلوں کا رنگ و بو
سرو کا قد، کبک کی رفتار، قمری کا گلو
ظلمتِ شامِ اودھ، صبحِ بنارس کا نکھار
آگرے کے تاج کی عظمت، ہمالہ کا وقار
سومناتی رفعتیں، بھارت کی تہذیبِ قدیم
پاٹلی پتر اکی شہرت، مگدھ کی شانِ عظیم

دلپذیریٔ اذاں، دلداریٔ ناقوسِ دیر

صحنِ مسجد کا تقدس، پرتوِ فانوسِ دیر

"ہر ہجن" کا فیض، حسنِ اعتقادِ برہمن

کمبھ کے میلے کی زینت، وسعتِ گنگ و جمن

بربط و چنگ و سرود و ارغنوں کے زیر و بم

دلکشی پردوں کی، آوازوں کے جادو، تال، سم

تلخیٔ انجام جب سب کوششیں ناکام ہوں

خوشنما سیبوں کی ہلکی ترشیاں جب خام ہوں

دیکھ کر یہ اقتباسِ کارگاہِ انس و جاں

کارپردازانِ قدرت میں ہوئیں سرگوشیاں

ایک بولا امتزاج ان کا قیامت ساز ہے

دوسرا کہنے لگا خاموش کوئی راز ہے

یہ عناصر ایک مدت تک رہے گرمِ عمل

آخرش تحریکِ عصمت سے ہوئے آپس میں حل

صبح دم جب گوشہ گوشہ مطلعِ انوار تھا

ذرہ ذرہ عالمِ نیرنگ کا سرشار تھا

اس مرکب کو اصولی جنبشیں ہونے لگیں

جنبشیں اپنے مقاصد سے قریں ہونے لگیں

یہ ہیولیٰ ارتقائی منزلیں طے کر گیا

شہ پرِ پرواز عفت سے بلندی پر گیا

اعتدال عنصری پہ پالیا جب اقتدار
عین فطرت کے مطابق شکل کی اک اختیار

آئی اعضا میں گدازی اور گرمی جسم میں
آئی رخساروں پہ سرخی اور نرمی جسم میں

پایۂ تکمیل کو پہنچا جو تھی یہ شاہکار
دست قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار

بسترِ نکہت پہ یہ پتلی جو محوِ خواب تھی
مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اٹھی شرما گئی

دیکھ کر شاعر نے اس کو نکتۂ حکمت کہا
اور بے سوچے زمانے نے اُسے عورت کہا

شریف کنجاہی

پیپائی

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو؟
رہنے دو اتنا نہ احسان کرو۔
میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لئے
کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی
اور پھر آنے کا امکان نہیں
روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں
کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو

کیوں جلاتے ہو مرے دل کے چراغ؟
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں

آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے

جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں

بتیاں خود ہی بجھا دیتے ہیں

زندگی کے سبھی آثار مٹا دیتے ہیں

اس طرح

میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں

آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے

اس پہ ہر رات نئے حملے ہوا کرتے تھے

آسمانوں سے کئی دشمن جاں طیارے

انہیں شمعوں کا نشانہ رکھ کر

بم گرا جاتے تھے اور آگ لگا جاتے تھے

اس کو تاریک ہی تم رہنے دو

دل کی دنیا میں اُجالا نہ کرو

میری اُمیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

تم نہیں مانو گے ؟

تم دیکھتے ہی جاؤ گے ؟

اچھا دیکھو !

لو جلاؤ میرے سینے کے چراغ

دل کی بستی میں چراغاں کر دو

پھر مرے جینے کا ــــ یا مرنے کا ــــ ساماں کر دو

طالب باغپتی

دہقانی لڑکی

(۱)

اُجلا نکھرا، چاند کا ٹکڑا! بھولا بھٹکا، صبح کا تارا!
فطرت کا وارستہ جلوا شبنم کا آوارہ قطرا!
حسنِ مجسم، پیکرِ زہرا گاؤں کی ملکہ، دخترِ صحرا!

(۲)

کانٹوں میں اک پھول کھلا ہے سارا جنگل مہک رہا ہے!
دنیا اُلٹی گھوم رہی ہے پتی پتی جھوم رہی ہے!
بے خود ہیں خاموش فضائیں وجد میں ہیں مدہوش ہوائیں!

لوٹ رہی ہے ہوش کی دنیا
گاؤں کی ملکہ دخترِ صحرا

(۳)

بے ترتیب پریشاں گیسو اُلجھن رشکِ رمِ آہو!
بکھری بکھری بھوریں باہیں تیز نکیلی پلک نگاہیں
لالہ رُخ طاؤسی گردن بھولی صورت سادی چتون!
جوہی کا نورستہ غنچہ!
گاؤں کی ملکہ دخترِ صحرا!

(۴)

جامن کی اک شاخ جھکا کے چہرے کو پتوں میں چھپا کے!
گاؤں کو نغموں سے جگا کے رستے والوں سے شرما کے!
زانو پر اک پاؤں اٹھا کے یوں خود کو تصویر بنا کے!

دیکھ رہی ہے رستہ چلتا
گاؤں کی ملکہ، دختر صحرا!

(۵)

پیروں میں کیکر کے بچھوے   کانوں میں سنیکوں کے بالے!
زیبِ گلو کنول کی مالا   آنکھ میں کاجل کا دنبالا!
سیدھے تیر چلانے والی   ہرنی کو شرمانے والی!
فخرِ بیاباں، عالم آرا!
گاؤں کی ملکہ، دخترِ صحرا!

عابد لاہوری

ساقی نامہ

فسونِ خرد سے ہے دل تلخ کام   پلا ساقیا بادۂ لعل فام
دلِ شادماں ہے نہ طبعِ جواں   مجھے کھا گئی فکرِ سود و زیاں
نہیں کم یہ شرمندگی ساقیا   گئی رائیگاں زندگی ساقیا
مغنی کوئی نغمۂ دردناک   جسے سُن کے ہو جائے دل چاک چاک
دُرت میں کدارا بجا چنگ پر   کہ آئے طبیعت مری رنگ پر
سنا کوئی پنجاب کی داستاں   کہ دل پر ہے بارِ محبت گراں
وطن ہے مرا حسن کی سرزمیں   کمی اس جگہ دلبروں کی نہیں
یہاں رنگِ احبابِ محفل نہیں   یہاں جمع اسبابِ محفل نہیں

یہاں دہلوی خوش کلامی نہیں
اصولِ زباں کی غلامی نہیں

یہاں خنجرِ ناز ہے خوں فشاں
یہاں خاک کا رنگ ہے ارغواں

یہاں ساز میں سوز پانی میں آگ
یہاں جوگ میں مل گیا ہے بہاگ

یہاں موت سے کھیلتا ہے جنوں
یہاں روز بہتا ہے دریائے خوں

یہاں نوجوانی سے ڈرتی ہے موت
یہاں مرنے والوں پہ مرتی ہے موت

مغنّی سن اے رازدانِ بہار
بہت تیز ہے کاروانِ بہار

کلی کو چٹکنے کی فرصت نہیں
ہوا کو مہکنے کی مہلت نہیں

اٹھا اے زینتِ انجمن رقص کر
اٹھا اے رشکِ سرو سمن رقص کر

ذرا ساز سے ناز کے سُر ملا
بڑی دیر کے بعد یہ گُر ملا

کہ مستی میں کھلتا ہے رازِ حیات
اسی سر پہ بجتا ہے سازِ حیات

بہار آئی ساقی بطِ مے اٹھا
ہتھیلی پہ تختِ جم رکھ کے اٹھا

دکھا کوئی محفل کو جادوگری
اتار اپنے شیشے میں ساقی پری

مئے لعل کو آبِ حیواں بنا
خطِ جام سے کو رگِ جاں بنا

نہیں قید کچھ چھیڑ دیں ٹھاٹھ کو
کوئی شے کسی دل نشیں ٹھاٹھ کی

کوئی نغمہ شاہانہ ہو یا شتا سہاز
کوئی دُھن بطرزِ عراق و حجاز

کوئی سُر ہو کومل رکھب یا گندھار
کوئی تال ہو دادرا یا دھمار

سن اے نغمہ گر اے بہار آفریں
تری ساحری پہ ہزار آفریں

خرد کا ہے شیرازہ بکھرا ہوا
سنا دے کوئی راگ نکھرا ہوا

"کہانی ہم اپنی سنانے لگے
وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگے

وہ پہلو میں ہیں اور شامِ بہار
یہی خواب رہ رہ کے آنے لگے

حیا سے جو کرتے نہ تھے ہم سے بات
وہ اب چٹکیوں میں اڑانے لگے

دیے حسن نے ایسے ایسے فریب　　کہ ہم عشق سے جی چرانے لگے
وہ سُن لیں جو عابدؔ یہ رنگیں غزل　　تو محنت ہماری ٹھکانے لگے

عرشؔ ملسیانی

میں کیوں بھول جاؤں

تری چشم مے گوں کا لبریز ساغر　　جوانی تری کیف آور جوانی
گلستاں در آغوش حسن تبسّم　　وہ تیرے لب سُرخ کی گل فشانی
تکلّم کے انداز خاموشیوں میں　　زبان نظر پہ حیا کی کہانی

تو ہی مجھ سے کہدے میں کیوں بھول جاؤں

وہ سانسوں کی تیزی وہ سینے کی دھڑکن　　وہ دونوں کا چھُپ چھپ کے آنسو بہانا
وہ تجدیدِ اُلفت کے سو سو بہانے　　وہ اک دوسرے سے یوں ہی روٹھ جانا
وہ ترکِ محبت کے الزام دے کر　　کسی کا کسی کو ہنسی میں رُلانا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ پاسِ ادب وہ خلوصِ محبت — وہ قیودِ تمنا میں خاموش رہنا
وہ نظّارگی میں تحیّر کا عالم — خود اپنی نگاہوں سے خاموش رہنا
رضا جو طبیعت وہ تعلیم کیسی — غم و رنج میں بھی وفا کوش رہنا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

سوالوں کا طومار سہمی زباں میں — مگر راز دل کا نہ اظہار کرنا
نگاہیں ملانے میں تو اک جھجک سی — مگر دل ہی دل میں مجھے پیار کرنا
وہ عرضِ محبت پہ معصوم وعدے — وہ لکنت زباں کی وہ اقرار کرنا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

تری چشمِ پُر نم وہ مسعود ساعت — یقیں بن گیا جب گمانِ محبت
محبت کے دن اور وہ فرقت کی راتیں — دعائیں تھیں جب ترجمانِ محبت
وہ خط جن کا ہر لفظ اک داستاں تھا — وہ جذبات سے پُر بیانِ محبت

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی کی بہاریں — وہ گلپوش راتیں وہ دلکش نظارے
مناظر سمٹتے ہوئے آبِ جو میں — فلک پر چمکتے ہوئے چاند تارے
وہ تھک کر کسی کا یوں ہی بیٹھ جانا — وہ اٹھنا کسی کا کسی کے سہارے

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ طوفانِ جذبات وہ زورِ تمنا — وہ جوشِ محبت وہ پُر شوق باتیں
وہ گھڑیاں وہ آرام و راحت کی گھڑیاں — وہ فرحت کے دن وہ مسرت کی راتیں
وہ گھاتیں وہ گھاتوں کے پھر دیس میں حد کے — وہ وعدے وہ وعدوں کی پیچیدہ گھاتیں

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

مآلِ مسرت وہ مجبور آنسو — وہ کیفِ طرب کا غمِ انجام ہونا
پُر الزام باتیں وہ سب کی زباں پر — محبت کے قصّے کا وہ عام ہونا
وہ برگشتہ خاطر ترے لوگوں کی باتیں — وہ معصوم روحوں کا بدنام ہونا

تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ دن تفرقہ خیز مجبوریوں کا فریب مقدر کی وہ چیرہ دستی
خمارِ مئے عیش اور نامرادی وہ مرگ تمنا وہ انجام مستی
رسوم کہن کی ستم آفرینی زمانے کا جور قدامت پرستی
تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

علی سردار جعفری

انفرادیت

ٹوٹا ہوا ستارہ

آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامانِ ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پُر کرتا ہوا آئینۂ فطرت کو تار

کس قدر بے باک کتنا تیز کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
ہو چند دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی شکنوں کو دبیلائے ہوئے ہے کوہسار
سہما ہوا سے جبیں آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا ہے کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار
لیکن ایسا انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتا ہے اپنی تابناکی کا شکار

عظیم الدین احمد

عالمِ تنہائی

وہ جس کے تبسم سے
کھلتی تھی کلی دل کی
وہ جس کے اشاروں پر
چلتی تھی گھڑی دل پہ
ہے زیرِ زمیں پنہاں
دل اُس کا مگر خواہاں
بنتا تھا کسی دن وہ
اسباب کی دنیا ہیں

آتا ہے نظر لیکن
اب خواب کی دنیا ہیں
آتے ہیں کبھی آنسو
آنکھوں ہی میں پیتا ہوں
جیتا ہوں جو تنہا ہیں
وہ خواب میں جیتا ہوں
ہے مے تو وہ بے رونق
ہیں دیدۂ تر اختر
گل جتنے ہیں گلشن میں
وہ خار ہیں یا اخگر
دنیائے حقیقت اب
اک یاس کی دنیا ہے

تنہائی کے عالم نے
اک راہ دکھائی ہے۔
"مل جاؤ گے تم اس سے"
یہ آس بندھائی ہے
اے عالمِ تنہائی!
اے عالمِ تنہائی!!
تو غیب کی دنیا ہے!
تو آس کی دنیا ہے!!

علی احمد

صبحِ بنارس

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی — صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی
چور کی طرح دبے پاؤں چلی بادِ صبا — ہر قبائے گلِ نوخیز کو مسکاتی ہوئی
آئی گردوں سے دھندلکے میں عروسِ شبنم — موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی
جل بجھی شمع ہوئی رات کی محفل خاموش — بزمِ تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی
اڑ چلی نکہتِ گل چھوڑ کے دامن گل کا — بادِ سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی
جلوہ گر صبحِ بنارس ہوئی رفتہ رفتہ — شب کا آنچل رُخِ پُرنور سے سرکاتی ہوئی
دور اندھیرا ہوا، تقدیر کھلی گنگا کی — ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی
نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی — قلزمِ حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرّے ذرّے کو تبسم سے بناتی رنگیں — بجلیاں چشمِ فسوں ساز سے برساتی ہوئی
کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں — ساغرِ عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی
اپنے گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم — خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی
کوئی پانی میں اتر آئی نہانے کے لئے — کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی
بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہو جسمِ سیمیں — بجلیاں پھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی
کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی گنگا میں — نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر — موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہوگیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر
آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی منظور حیدرآبادی

مہمانداری

پھیلی ہے فضاؤں میں خوشی میری نظر کی
ہنستی نظر آتی ہیں فضائیں مرے گھر کی

دل شاد مرے اہل و عیال آج بہت ہیں
مصروف ہیں وہ بھی نہیں مصروف فقط میں

رکھی ہے سلیقے سے ہر اک کام کی تیزی آج
مہمان مرے گھر میں ہیں کچھ میرے عزیز آج

شادی کا مکاں گھر مرا معلوم نہ ہو کیوں
مجمع ہو جب اتنا تو بھلا دھوم نہ ہو کیوں

بھائی بھی ہیں بہنوئی بھی بھاوج بھی بہن بھی
بیٹھا ہے بھتیجا بھی بھتیجے کی دلہن بھی

بچی ادھر اک بیٹھ کے تکتی ہے دلہن کو
کچھ طفل ستاتے ہیں اُدھر اپنی بہن کو

بچوں پہ جھلک خاص ہے تنویر سحری کی
اُٹھ بیٹھے ہیں سب سنتے ہی آواز گجر کی

دلکش یہ فضا صبح کی یہ نور کا تڑکا
بلبل کی طرح بول رہا ہے کوئی لڑکا

بے وجہ کوئی رونے پہ آمادہ ہوا ہے
حیرت سے نئے گھر کو کوئی دیکھ رہا ہے

بیٹھا ہے یہ چپ دوڑ رہا ہے وہ خوشی سے
کھانے کے لئے ضد کوئی کرتا ہے ابھی سے

کرتا ہے جو سامان ضیافت کو فراہم
آ آ کے مرے کان میں کچھ کہتی ہیں بیگم

ہوتا ہے جو خوبی سے ضیافت کا سرانجام
لڑکی کے ذریعے سے بھی پہنچاتی ہیں پیغام

آتی بھی ہیں جاتی بھی ہیں بیگم سوئے مطبخ
ماماؤں میں بے وقت جہاں ہوتی ہیں خچ خچ

راحت نہ ملے کیوں انھیں ہلکی تگ و دو میں
سائے کی طرح ساتھ ہے لڑکی بھی جلو میں

ننھی ابھی اٹھی نہیں پہلو سے بھیا کے
لیتی ہیں وہ رہ رہ کے مرے اسکی ہنسی کے

لڑکے مرے خوش ہو گئے اُدھر دیکھ رہے ہیں
اخلاص و محبت سے مخاطب ہوں جدھر میں

مجمع یہ عزیزوں کا محبت کی یہ باتیں
ان پیار کی باتوں میں نہ چوکیں ہیں نہ گھاتیں

انوار تبسم کے تکلم سے ہیں پیدا
ضو صبح کی اس منظر دلکش پہ ہے شیدا

باتوں کا ابھی تھا طربی سلسلہ جاری
نرگس نے کہا آ کے ہے تیار نہاری

فراق گورکھپوری

آج کی بات

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج — تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج
وہ سر اٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج — موجِ حیات موج سے ٹکرا رہی ہے آج
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج — ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج
جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر — کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چلے — ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج
یکسر جہانِ حسن بھی بدلا ہوا سا ہے — دُنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج
ہر تارِ شکست ساز میں صد لحن سرمدی — یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج
یا زندگیٔ دہر تھی سوگند موت کی — یا موت زندگی کی قسم کھا رہی ہے آج

یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے — کیا شے ہوائے دہر کو سنکا رہی ہے آج
ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز — جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج
افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے — تیوری زمیں کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج
پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو — پھر آتشِ خموش کو اُکسا رہی ہے آج
برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے ان دنوں — اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج
اک موجِ درد سینے میں لرزاں ہے اس طرح — ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروز پہ فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

فیض احمد فیض

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے ؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے !
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے !

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

قیوم نظر

خلشِ تائثر

خاموش ہوا بھیڑوں کا گلّہ چلتے چلتے ممیا کر
جا پہنچا شاید باڑے میں گوسی رستے میں پھیلا کر
چپ چاپ کھڑا ہے دور اُدھر وہ جنگل کالی چیلوں کا
سرسبز پہاڑوں کو پرپھول بنانے والی چیلوں کا
آواز نہیں آتی اب جھیل کی جانب سے مرغابی کی
سنسان فضائے جاں ہوا ہیں لرزاں روح خموشی کی
یوں لائی دوش پہ لاش سی کیا رنگین دن کی بربادی کی
یہ شام یہ گہری شام یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی!

قدرت کے سکوتِ مجسم کی اس ہیبت زا آرائش سے
وادی کے ذرّے ذرّے کی ہم آہنگی کی نمائش سے
ہر نقش شجر، ہر فیل نما پتھر دنیا ہے طلسموں کی
حد ہی نہیں آتی کوئی نظر اس طرفہ فسوں سی قسموں کی
ہر شے پہ خواب سا طاری ہے اور میں ہوں صرف بیخوابی
لینے ہی نہیں دیتی دم مجھ کو میری فطرتِ سیمابی
اے کاش کبھی کم کر سکتی میرے بھی دل کی بیتابی
یہ شام یہ گہری شام یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی
میں مصنوعات کا پروردہ بلکہ انسان بھی مصنوعی
میرا سامان بھی مصنوعی میرا ایمان بھی مصنوعی
بسنے والا میدانوں کے ہنگامہ پرور شہروں کا
بے ربط سکوں سے ناواقف اور شوریدہ سر شہروں کا

میں قدرت کے اسرار و رموزِ پنہاں سے آگاہ کہاں

اس اندھیارے کے اتھاہ سمندر کی مرے دل میں چاہ کہاں

اور مجھ کو دکھاتی ہے نورِ حقیقت کے جلووں کی راہ کہاں

یہ شام یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

یہ منظر خوش آیند تو ہیں، میں ان سے مگر کیوں ڈرتا ہوں؟

کیوں ان کی دل آویزی کو وحشت ناک تصور کرتا ہوں؟

کیوں مجھ کو میسر سنگ و شجر کا سا بھی سکونِ قلب نہیں؟

کیوں میری دنیا اس دنیا سے جا کے بسی ہے دور کہیں؟

کیوں میں نے ڈالا ہے اپنے ہی جی کو آپ ہلاکت میں؟

کیوں ہو ہی نہیں جاتا میں خود پیوستہ جہان قدرت میں؟

کیوں لے ہی نہیں لیتی مجھکو اپنی آغوش کی وسعت میں

یہ شام یہ گہری تاریکی، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی؟

کلیم الدین احمد

نقش ابد

میں کُنجِ عافیت میں

تھا عافیت بداماں

دل مثلِ گُل تھا خنداں

شاخِ طرب پہ رقصاں

اس کنجِ عافیت میں

(یہ کیا ہوا خدایا!)

اب ہیں الم کے ساماں

دل ہے کہ شمعِ گریاں

سیماب وار رقصاں

اس کنجِ عافیت میں

اب عافیت کہاں ہے؟

وہ پھول جس کی نکہت

جاں تھی مرے چمن کی

وہ شمع جس سے زینت

تھی اپنی انجمن کی

نظروں سے اب نہاں ہے

اے پھول تو کہاں ہے؟

اے شمع کیوں نہاں ہے؟

یہ زندگی ہماری

اک آہ دم بدم ہے۔

گویا ہماری ہستی

صورت گرِ عدم ہے

اس آہ دم بدم کو

صورت گرِ عدم کو

اے صانعِ حقیقت!

نقشِ ابد بنا دے

نقشِ ابد بنا دے

گوپال متّل

ایک حُسن فروش لڑکی کے نام

مری جاں گو تجھے دل سے بھلایا جا نہیں سکتا
مگر یہ بات میں اپنی زباں پر لا نہیں سکتا
میں تجھ کو چاہتا ہوں والہانہ پیار کرتا ہوں
میں گانا چاہتا ہوں پر یہ نغمہ گا نہیں سکتا
تجھے اپنا بنانا موجبِ راحت سمجھ کر بھی
تجھے اپنا بنالوں یہ سمجھ میں آ نہیں سکتا
بنا سکتا ہوں شب کو اپنے بستر کی تجھے زینت
مگر دن میں ترے قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا

ہوا ہے بارہا احساس مجھ کو اس حقیقت کا
ترے نزدیک رہ کر بھی میں تجھ کو پا نہیں سکتا
مرے دست ہوس کی دسترس ہے جسم تک تیرے
میں تیرے روح کی گہرائیوں تک جا نہیں سکتا
میں تیرے رس بھرے ہونٹوں کو پیاری چوم سکتا ہوں
مگر میں تیرے دل پر آہ قبضہ پا نہیں سکتا
ترے دل کی تمنا بھی کروں تو کس بھروسے پر
میں خود درگاہ میں تیرے یہ تحفہ لا نہیں سکتا
مری مجبوریوں کو بھی بہت کچھ دخل ہے اس میں
تجھی کو مورد الزام میں ٹھہرا نہیں سکتا
میں تجھ سے بڑھ کے اپنی آبرو کو پیار کرتا ہوں
میں اپنے عزت و ناموس کو ٹھکرا نہیں سکتا
ترے ماحول کی پستی کا طعنہ دوں تجھے کیوں کر
میں خود ماحول سے اپنے رہائی پا نہیں سکتا

مجاز

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں　　جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال　　جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی　　رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر گرجتی ہوئی شمشیر سی

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر کہتی ہے کہ میخانے میں چل　　پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں　　ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی　　جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے سے اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب　　جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں

اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لئے اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے

اک مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں اُن کو پا سکتا ہوں میں آسرا بھی چھوڑ دوں

ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں

زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے

سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں اس کا گلشن پھونک دوں اس کا نشیمن پھونک دوں

تخت سلطاں کیا ہے سارا قصر سلطاں پھونک دوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجنوں گورکھپوری

بلبل

چمن میں لائی ہے پھولوں کی آرزو تجھ کو
ملا کہاں سے یہ احساسِ رنگ و بو تجھ کو

تری طرح کوئی سرگشتۂ جمال نہیں
گلوں میں محو ہے کانٹوں کا کچھ خیال نہیں

خزاں کا خوف نہ ہے باغباں کا ڈر تجھ کو
مآلِ کار کا بھی کچھ خطر نہیں تجھ کو

خوش اعتقاد و خوش آہنگ خوش نوا بلبل
وہی ادا ہے تری اور وہی صدا بلبل

جگر کے داغ کو پُرنور کر دیا کس نے؟
تجھے اس آگ سے معمور کر دیا کس نے؟

یہ دل یہ درد یہ سودا کہاں سے لائی ہے؟
کہاں کی تو نے یہ طرزِ فغاں اڑائی ہے؟

تجھے بہار کا اک مرغِ خوش نوا سمجھیں؟
کہ دردمند دلوں کی کوئی صدا سمجھیں؟

سوا اک آہ کے ساماں بہت دیا ہے کیا؟
تو ہی بتا ترا سرمایۂ وجود ہے کیا؟

وہ نقدِ جاں ہے کہ ہے نالۂ حزیں تیرا
نشانِ ہستیِ موہوم کچھ نہیں تیرا!

اسے بھی وقفِ تمنائے یار کر دینا!
نثارِ جلوۂ گل جانِ زار کر دینا!

ہزار رنگ خزاں نے بہار نے بدلے
ہزار روپ یہاں روزگار نے بدلے

تری قدیم روش دیکھتا ہوں بچپن سے
ہے صبح و شام تجھے کام اپنے شیون سے

اثر پذیرِ حوادث ترا ترانہ نہیں؟
دیارِ عشق میں یا گردشِ زمانہ نہیں؟

ترا ثبات کہیں ہے نہ ہے وطن تیرا
رہے گا یوں ہی سیرِ چمن چمن تیرا

ترا جہان ہے بالا جہانِ انساں سے
کہ بے نیاز ہے تو حادثاتِ امکاں سے

ترا فروغ فروغِ جمالِ جاناں ہے
ترا نشاط نشاطِ گل و گلستاں ہے

تری حیات کا مقصد ہی دردمند داری ہے
ترا معاملہ سود و زیاں سے عاری ہے

ازل کے دن سے ہے محوِ جمالِ جانانہ   رہے گی تا بہ ابد ماسوا سے بیگانہ
مجھے کس آگ نے حرص و ہوا سے پاک کیا   تمام خرمنِ ہستی جلا کے خاک کیا

مجھے بھی دے کوئی دارُوئے خود فراموشی   جہاں و کارِ جہاں سے رہے سبکدوشی
متاعِ ہوش کو اک جستجو میں کھوتا ہے   مجھے بھی یعنی ترا ہم صفیر ہوتا ہے

تو خوش بنال مرا با تو حسرتِ یاری ہست
"کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاری ہست"

محمد دین تاثیر

رس بھرے ہونٹ

رس بھرے ہونٹ
پھول سے ہلکے
جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کے ڈھلکے

رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں! —
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل! —
وقت صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگِ منزل نما نہ آج نہ کل —
دفعتاً دور — دور! — آنکھ سے دور
شفقِ شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اُٹھے
ایک دھوکا — سراب — نبعِ نور! —

رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
یوں ترستے ہیں یوں لرزتے ہیں! —

مختار صدیقی

رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے!

فرطِ بیتابی سے اُٹھ اُٹھ کے نظر بیٹھ گئی
تھام کر اس ہر آہٹ پہ جگر بیٹھ گئی
میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے
موجِ مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا داماں
تارے چپکے ہیں کہ اب گردِ سفر بیٹھ گئی
بھیگتی رات نہا کر مرے اشکِ خوں میں

جانے کو اٹھی ہی تھی اُٹھ کے مگر بیٹھ گئی

اُس نے دیکھا کہ مری رانی لجاتی آئی
آنکھیں ملتی ہوئی ننھوں کو جگاتی آئی

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل شکن آلود لباس
چھوٹی آنکھوں میں مچلتی ہوئی نیندوں کی جھلک
سوگئی تھی ذرا خود سب کو سُلاتے شاید
نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پہ دستک
چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر
اوجِ افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی دمک
شدّتِ مہر سے چھلک کر بنے تند و بے دُرد
اُس کے ماتھے سے چرا لیتی ہے سونے کی ٹِلک
چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں چلی ہولے ہولے

کردے غمّازی مبادا کہیں چھاگل کی چھنک
سُرخی ٹیکے کی جبیں پہ ذرا پھیلی پھیلی
جس طرح جام سے کچھ تھوڑی سی مے جائے چھلک

سودا { "زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی آنکھیں ہیں کہ دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہیں دو بالک!" }

میرے غم خانے پہ پہنچی تو کچھ آیا جو خیال
چوڑیاں چھوڑدیں چھاگل بھی نہیں چھاں چھنک

شکوے آئی تو ہے نیند کی گہرائی سے
چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

مخدوم محی الدین

ٹوٹے ہوئے تارے

نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کی سیل رواں میں ڈوب گئی

سمن بران فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا

وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا

دلوں میں بیٹھ گیا تیر آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

یہ ساکنانِ فلک دردِ غم کو کیا جانیں
یہ خاکیوں کے رہ بیش و کم کو کیا جانیں

وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے

فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیرِ آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

میراجی

ترغیب

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے!
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے حدِ ادراک سے دور لے جا رہی ہے!

جوانی کا خوں ہے
بہاریں ہیں موسم زمیں پر!
پسند آج مجھ کو جنوں ہے؛
نگاہوں میں ہے میرے نشے کی اُلجھن

کہ چھایا ہے ترغیب کا جال ہر اک حسین پہ ؟
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے !

قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آرہے ہیں !
حسین اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں !
یہ ملبوس ریشم کے اور اُن کی لرزش،
یہ غازہ ـــــ یہ ابٹن ؛
نسائی فسوں کی ہر اک موہنی آج کرتی ہے سازش ؛
مرے دل کو بہکا رہی ہے !
مرے ذہن میں آرہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو !

میراجی

اونچا مکان

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
اے تمدّن کے نقیب !
تیری صورت ہے مہیب !
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا ؛
ڈھل کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں، مگر
اُن میں اک جوش ہے بیداد کا فریاد کا اک عکسِ دراز،
اور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے،
کیا کوئی روحِ حزیں

ترے سینے میں بھی بیتاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں

گھٹ کے لہریں ترے گیتوں کی مٹیں، مجھ کو نظر آنے لگا،
ایک تلخابہ کسی بادۂ بد رنگ کا اک ٹوٹے ہوئے ساغر میں،
نشۂ مے سے نظر دھندلی ہوئی جاتی ہے۔

رات کی تیرہ فضا کیوں مجھے گھبراتی ہے؟
رات کی تیرہ فضا میں تری آنکھوں کی چمک مجھ کو ڈرا سکتی نہیں ہے میں تو
اس سے بھی بڑھ کے اندھیرے میں رہا کرتا تھا،
اور اُس تیرگیٔ روح میں رخشاں تھے ستارے دُکھ کے،
اور کبھی بھول میں ہر نجم درخشاں سے لپک اٹھتے تھے شعلے سُکھ کے،
جیسے روزن سے ترے تان لپکتی ہوئی پھیلاتی ہے بازو اپنے،
جذب کر لیتا ہے پھر اس کو خلا کا دامن،

یاد آنے لگے تنہائی میں بہتے ہوئے آنسو اپنے
وہی آنسو وہی شعلے سُکھ کے،
لیکن اک خواب تھا، اک خواب کی مانند لپک شعلوں کی تھی،
مری تخئیل کے پرطائر زخمی کے پروں کے مانند،
پھڑپھڑاتے ہوئے بیکار لرز اُٹھتے تھے،
مرے اعضا کا تناؤ مجھے جینے ہی نہ دیتا تھا، تڑپ کر، ایک بار،
جستجو مجھ کو رہائی کی ہوا کرتی تھی،
مگر افسوس کہ جب درد دوا بننے لگا مجھ سے وہ پابندی ہٹی،

اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لئے
بھول کر تیرگیٔ روح کو میں آپہنچا،
اس بلندی کے قدم میں نے لئے

جس پہ تو سینکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ تھے سے
تیرے بارے میں سنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایات عجیب،
میں یہ سنتا تھا ترے جسم گرانبار میں بستر ہے بچھا،
اور اک نازنیں لیٹی ہے وہاں تنہائی
ایک بھیکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے،
ذہن میں اس کے، اگر وہ بیتاب
منتظر اس کی ہے پردہ لرزے
پیرہن ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے
اور در آئے اک ان دیکھی، انوکھی صورت
کچھ غرض اس کو نہیں ہے اس سے
دل کو بھاتی ہے نہیں بھاتی ہے

آنے والے کی ادا،—
اس کا ہے ایک ہی مقصود، وہ استادہ کرے
پھر اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے
اور وہ بن جائے ترا ئد مقابل پل میں
ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ بے لاگ، ادا دے سکے بغیر
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے روح تماشائی کو—
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزش چشم در سے
ریگ کے قصر کے مانند شکیبا کرے،

بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقش عجیب
ایک گرتی ہوئی دیوار کی مانند لچک کھا جائے .

یہ حکایات مرے ذہن میں اک بوسۂ خراماں بن کر
جب کبھی چاہتی تھیں رقص کیا کرتی تھیں ،
اور اب دیکھتا ہوں سینکڑوں آنکھوں میں تری
ایک ہی چشمِ درخشاں مجھے آتی ہے نظر ،
کیا اسی چشمِ درخشاں میں ہے شعلہ سکھ کا ؟
ہاتھ سے اپنے اب اس آنکھ کو میں بند کیا چاہتا ہوں .

ن.م.راشد

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان، مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو ،
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے !

سیم گوں ہاتھوں سے اے جانِ ذرا
کھول مے رنگ جنوں باختہ آنکھیں اپنی
اسی مینار کو دیکھ،
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک، افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں
ایک عفریت ——— اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشان
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھّی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں
ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں

بھوک کا شاہسوار

سخت گیر اور تنومند بھی ہے!

میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح

ہر شب عیش گذر جانے پر

بھر کے خس و خاشاک نکل جاتا ہوں

چرخ گرداں ہے جہاں

شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں

بے بسی میری ذرا دیکھ سہی

مسجد شہر کے میناروں کو

اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

جب انھیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے

یوسف ظفر

میرا ماضی

(۱)

میں یہ کہتا ہوں، نہ دیکھو میرے ماضی کی طرف،

تاب نظارہ کسے ہے کہ اُسے دیکھ سکے؟

میرا ماضی — وہ تو اک خواب تھا افسانہ تھا،

کس کو افسانے کی باتوں پہ یقین آئے گا! —

لیکن آئے گا یقین آئے گا سب کو اب تو

میرے خوں میں ہیں لپکتے ہوئے شعلوں کے شرارے،

میرے الفاظ میں تاثیر ہے فریادوں کی،

میرے انداز میں تڑپے ہوئے نغمے ہیں نہاں،
میرے احساس میں کانٹوں کی زبانیں ہیں چھپی،
اب تو جو بات کہی دل میں اُتر جائے گی ——

میں تو کہتا ہوں نہ دیکھو مرے ماضی کی طرف،
دل نازک پہ گراں گزریں گے میرے قصے،
تم میں یہ جرأت بیباک تماشہ کب ہے!
میرے افسانے بھڑک اُٹھیں گے، پھر کیا ہوگا؟ ——

(۲)

گھل کے مٹ جاتی ہیں جب رات کی سب آوازیں
نیند کے سائے لپٹتے ہیں مری آنکھوں سے
خود بخود آتی ہیں ایسے میں کئی آوازیں
دُکھ بھری درد سے معمور، غمیں آوازیں

کئی آوازیں لپک اُٹھتی ہیں ان کانوں میں ۔
کان بھی ایک مصیبت ہیں، تمھیں کیا معلوم،
میرے احساس میں اک آگ سلگ جاتی ہے
اور آنکھوں کے تہی جام چھلک جاتے ہیں

(۳)

سادہ پانی بھی مئے ناب ہے اس گرمی میں
ایک ٹھنڈک سی رگ و پے میں اُتر جاتی ہے،
جیسے آنکھوں کے چھلکنے سے سکوں پاتی ہے
وہ حرارت جسے ہم حاصل غم کہتے ہیں ——

روتی ہو؟ —— رو نہیں —— یوں مجھے غمگیں نہ کرو
اور بڑھ جائے گی اب سینۂ سوزاں کی جلن،
میں نہ کہتا تھا نہ دیکھو مرے ماضی کی طرف،
میرے ماضی میں کہاں راحت دل کے ساماں

اس کے گلشن میں تو وہ پھول ہیں جن کے شعلے
میرے اشکوں سے نکھرتے ہیں، بکھر جاتے ہیں ——

(۴)

میں نے جو دیکھا تھا اک خواب تھا اُفسانہ تھا ——
میں یہ کہتا ہوں نہ دیکھو مرے ماضی کی طرف،
میرے ماضی میں کہاں راحت دل کے ساماں،
کیوں مری آگ میں جلنے کی قسم کھاتی ہو ؟
چھوڑ دو ان باتوں کو، اب رہنے دو ان باتوں کو،
آؤ اک اور ہی منظر کی طرف اب دیکھیں
آؤ اک اور ہی دنیا کوئی آباد کریں ——،
جس کے شعلوں میں ہوں پھولوں کے شرارے رقصاں،
جس کے خاروں میں ہو احساس محبت کی خلش

جس کے سایوں میں ہوں خوابوں کی سہانی راتیں ——
میرے ماضی کے فسانے میں بھلا کیا ہوگا

(۵)

پھر وہی اشک ! —— وہی شمعیں جلا دیں تم نے ؟
اچھا ہے —— تربت ماضی پہ چراغاں ہی سہی،
اب یہی خوب ہے —— اچھا ہے —— بہت اچھا ہے !
لیکن اس پر بھی ذرا غور کرو۔ دیکھو تو
کل یہی اشک، یہی تربت ماضی کے چراغ
اسی ماضی ہی کی مسموم ہوا سے بجھ کر
میرے کانوں میں صدا بن کے اُتر جائیں گے،
اور پھر —— ہوگا وہی کچھ جو ہوا کرتا ہے ——